ایجادی قفس میں شطرنج کے کھلاڑی

محمد حنیف خان

شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ (یوپی) موبائل: 8874525290

اودھ ہندستان کا وہ زرخیز علاقہ ہے جہاں صرف کھیت اور باغات ہی نہیں لہلہاتے ہیں بلکہ یہاں تخلیقی وفور موجیں مارتا ہے، خواہ وہ شطرنج کا کھیل ہو یا ایجادی قفس یا پھر ان دونوں میں پھنس کر اودھ کے انگریزوں کے زیر نگیں چلے جانے پر ماتم، ہر جگہ آپ کو تخلیقی وفور نظر آئے گا۔ اودھ سے انتزاع سلطنت پر یوں تو بہت کچھ لکھا گیا، لیکن دو افسانے ایسے تخلیق کئے گئے جن کی قرأت اگر ایک ساتھ کی جائے تو پورا منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ان دونوں کہانیوں کا کرافٹ اور ٹریٹمنٹ بالکل جدا ہے۔ کسی بھی سلطنت کے قیام یا اس کے زوال میں دو طبقوں کا سب سے اہم کردار ہوتا ہے۔ ایک شاہ، دوسرے اس کے کارندے جو اس کے ہاتھ پیر ہوتے ہیں، انتظام حکومت اور اس کے انصرام کی ساری ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ بادشاہ خواہ کتنا بھی مدبر ہو اگر اس کے کارندے ذی ہوش نہ ہوں تو اس کو کامیابی نہیں مل سکتی۔ دونوں کا بیدار مغز ہونا ضروری ہے، مگر اودھ کے زوال میں یہ دونوں طبقے برابر کے سہیم ہیں۔

پریم چند نے اپنے افسانے 'شطرنج کی بازی' میں جہاں نوابین اودھ کے شوق، لہو ولعب اور حکومت سے بے پروائی دکھاتے ہوئے ان کی حب الوطنی پر ماتم کیا ہے وہیں نیر مسعود نے اپنے افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا'' میں بادشاہ وقت کی ذہنی عیاشی اور سیاسی تدبر کے فقدان کا منظر نامہ کھینچا ہے۔ یہ دونوں کہانیاں مختلف اوقات میں لکھی گئیں اس کے باوجود اس وقت کے ماحول کو سمجھنے کے لیے ان دونوں کی قرأت ایک ساتھ ناگزیر ہے۔ قاری کسی بھی ایک کہانی کی قرأت کرے تو اس کے سامنے صرف ایک ہی گوشہ آتا ہے۔ جب پریم چند کے افسانے 'شطرنج کے کھلاڑی' کی قرأت کی جائے گی تو صرف نوابین اودھ کا کردار سامنے آئے گا اور جب طاؤس چمن کی مینا' کی قرأت کی جائے گی تو شاہ اودھ کے لہو ولعب اور شوق سامنے آئیں گے، لیکن جب ان دونوں کی قرأت ایک ساتھ کی جائے گی تو دونوں طبقے قاری کے سامنے اپنی حقیقتوں کے ساتھ آجاتے ہیں۔

پریم چند کی کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد جب پریم چند نے معاشی ضروریات کے لیے بنارس میں اپنا پریس قائم کیا اور وہ اس میں ناکام ہوگئے تو لکھنؤ کے دارالاشاعت 'گنگا پستک' مالا میں بطور مشیر ملازم ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنی یہ کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' تخلیق کی جو ہندی ماہنامہ 'مادھوری' میں ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس سے قبل پریم چند کی سات کہانیوں کا مجموعہ 'سوز وطن' شائع ہو چکا تھا جس میں وہ حب الوطنی کا نہ صرف درس دے چکے تھے بلکہ اس کی پاداش میں ان کی طلبی ہوئی اور سوز وطن کی کاپیاں ان کی آنکھوں کے سامنے جلائی بھی گئیں، مگر وہ اس سے باز نہیں آئے اور ۱۹۲۴ء میں یہ کہانی لکھ ڈالی۔

نیر مسعود کے افسانوں کا مجموعہ ''طاؤس چمن کی مینا' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تو ہر طرف نیر مسعود کی تخلیقیت کا ڈنکا بجنے لگا، ہر تخلیق کار کا کوئی ایک شاہ کار رہوتا ہے اور نیر مسعود کا شاہکار ان کا افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' ہے۔ یوں تو انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں، مگر ان ساری کہانیوں میں سب سے زیادہ اہم ان کی یہی کہانی ہے اس کی بھی وجوہات ہیں۔

سب سے پہلے دونوں کہانیوں کی تلخیص پیش کردوں تاکہ بات سمجھنے میں آسانی رہے۔

پریم چند کی کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' میں انھوں نے مرزا سجاد علی اور میر روشن کی شطرنج سے انتہا درجہ کی محبت دکھائی ہے۔ انھوں نے دونوں کو اس وقت کے امرا کی علامت بنا کر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح اس وقت کا معاشرہ خاص کر اعلیٰ طبقہ لہو ولعب میں ڈوبا ہوا تھا۔ شطرنج میں میں دونوں اس قدر محو رہتے ہیں کہ کھانے پینے تک کا خیال نہیں، دونوں کی بیویوں کو ان کا شطرنج سے اس طرح لگاؤ پسند نہیں۔

مرزا سجاد کی اہلیہ سر درد میں مبتلا ہیں اور یہ صاحب شطرنج میں مست، بالآخر وہ شطرنج کی بساط ہی پلٹ دیتی ہیں اور پھر میر روشن کے گھر پر بازی جمنے لگتی ہے، لیکن جب میر روشن کی اہلیہ کی آزادی میں خلل آتا ہے تو وہ اپنے ہی ایک نوکر کو شاہی ملازم بنا کر نواب کے دربار میں میر روشن کی طلبی کی اطلاع پہنچانے کا بندو بست کرتی ہیں جس سے دونوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ یہیں پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں کردار کس طرح بزدل اور کم ہمت ہیں۔ گرفتاری کے خوف سے دونوں ایک ویران مسجد منتخب کرتے ہیں اور شہ مات کا کھیل یہاں شروع کر دیتے ہیں، ایک دن انگریزی فوج آ جاتی ہے اور نواب واجد علی کو گرفتار کر لے جاتی ہے، مگر ان دونوں کے نہ کان پر جوں رینگتی ہے اور نہ ہی خون میں جوش آتا ہے، لیکن شہ مات کا کھیل کھیلتے ہوئے دونوں اپنے اپنے بادشاہ کو بچانے کے لیے آپس میں بھڑ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا قتل کر دیتے ہیں۔ یعنی اپنے اصلی بادشاہ پر جان نچھاور کرنے کے بجائے شطرنج کے بادشاہ کے لیے جان دے دیتے ہیں اور کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ (یہ کہانی نو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔)

نیر مسعود نے اپنی کہانی 'طاؤس چمن کی مینا' میں کالے خاں، اس کی بیٹی فلک آرا اور طاؤس چمن کی مینا فلک آرا کی کہانی پیش کی ہے۔ یہ کہانی فلیش بیک کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ اس تکنیک کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کو کہانی وہ جھلک دکھائی جاتی ہے جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے، لیکن یہ منظر ذرا مبہم ہوتا ہے تا کہ قاری کے اندر تجسس پیدا ہو۔ اس تکنیک میں لکھی گئی اکثر و بیشتر کہانیاں قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور نیر مسعود کی یہ کہانی بھی قاری کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہے۔ کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

روز کا معمول تھا میں باہر سے آتا، دروازہ کھٹکھٹاتا، دوسری طرف سے جمعراتی کی اماں کی کھانسنے کھنکھارنے کی آواز قریب آنے لگتی، اس سے پہلے ہی دوڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آہٹ دروازے پر آ کر رکتی۔ ادھر سے میں آواز لگاتا:

دروازہ کھولو کالے خاں آئے ہیں۔

دروازے کے پیچھے سے دبی دبی آواز آتی اور قدموں کی آہٹ دور بھاگ جاتی، کچھ دیر بعد جمعراتی کی اماں آ پہنچتیں۔

اس کے بعد نیر مسعود اپنی فلیش بیک کی تکنیک جاری رکھتے ہوئے یہاں تک پہنچتے ہیں:

روز کا یہی معمول تھا اور یہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب شاہی جانوروں کے داروغہ نبی بخش نے مجھ کو قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ملازمت دلائی تھی۔

یہاں سے پھر کہانی اپنی سمت میں چلتی ہے جو آخر تک برقرار رہتی ہے۔

کالے خاں کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور وہ حسین آباد کی ملازمت چھوڑ کر آوارہ گردی کرنے لگے تو داروغہ نبی بخش نے جو اس کے ہمدرد تھے، قیصر باغ کے طاؤس چمن میں ملازمت دلا دی، جہاں پرندوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کالے خاں کے سپرد ہوئی، یہاں طرح طرح کی چالیس اصیل پہاڑی مینائیں تھیں اور ہر مینا کا الگ الگ نام تھا جن میں ایک مینا کا نام فلک آرا تھا۔ اتفاق سے یہی نام کالے خاں کی بیٹی کا بھی تھا جس سے وہ بے انتہا محبت کرتا تھا جس کی وجہ سے اسے اس سے کچھ خاص انسیت ہو گئی۔ کالے خاں کی بیٹی فلک آرا نے پہاڑی مینا کا جب مطالبہ شروع کیا تو پہلے تو اس نے ٹالا، مگر ایک دن اس کے ذہن میں آیا کیوں نہ طاؤس چمن سے فلک آرا نام کی مینا کو ہی چرا لاؤں اور بیٹی کو دے دوں اتنی میناؤں میں کوئی گن بھی نہیں سکے گا اور اس نے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا، مگر ایک دن بادشاہ طاؤس چمن آ گئے اور اس پر نظر ڈالتے ہی ان کو اندازہ ہو گیا کہ فلک آرا غائب ہے۔ انھوں نے جب اس کی بابت سوال کیا تو کہہ دیا گیا کہ کہیں بیٹھی ہو گی۔ انہوں نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی، مگر کالے خاں سمجھ گیا کہ اگر وہ واپس نہیں لایا تو پکڑا جائے گا، اس لیے اسے واپس لا کر طاؤس چمن میں ڈال دیا۔ جہاں روز میناؤں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک دن بادشاہ انگریزوں کے ساتھ پھر طاؤس چمن پہنچ گئے اور ان کے سامنے جو تعلیم ان کو دی گئی تھی اس کا مظاہر کرنے کو کہا۔ ساری میناؤں تو وہی شعر اور لفظ بول رہی تھیں جو ان کو سکھائے گئے تھے، مگر ان میں فلک آرا تنہا ایسی مینا تھی جو پہلے تو خاموش رہی پھر اس نے کہنا شروع کیا فلک آرا شہزادی ہے، دودھ جلیبی کھاتی ہے کالے خاں کی بیٹی ہے۔

جس پر بادشاہ ناراض ہو گئے کہ ان کی مینا باہر کیسے گئی، چوری پر کالے خاں کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور قریب تھا کہ جرمانہ بھی لگتا، لیکن اس سے قبل ہی نواب واجد علی شاہ کے حضور اس نے درخواست دے کر پورا واقعہ بتایا کہ اس نے اپنی بن ماں کی بیٹی کے لیے یہ مینا چرائی تھی، جس پر اس کی نہ صرف سزا معاف ہو گئی بلکہ مینا بھی اس کو

دے دی گئی اور ایک سال کے اخراجات بھی پیشگی سرکار کی طرف دے دے گئے، مگر داروغہ نبی بخش کی وجہ سے اس کو مینا فلک آرا کو سونے کے پنجرے کے ساتھ ایک اجنبی شخص کے ہاتھوں فروخت کرنا پڑا، مگر بعد میں اس کے دوسرے خریدار بھی آ گئے جب ان کو معلوم ہوا کہ مینا فروخت ہوگئی ہے تو انہوں نے دوسرے ہی دن کالے خاں کو ایجادی قفس کی ایک گنگا جمنی کٹوری کی چوری کی پاداش میں گرفتار کرا دیا۔ طویل عرصہ بعد وہ اس وقت جیل سے رہا ہوا جب انگریزوں کا قبضہ اودھ پر ہوگیا اور اس کی خوشی میں قیدی رہا کئے گئے۔ کالے خاں اپنے گھر کے لیے نکلا اور اس کو جب معلوم ہوا کہ شاہ عالم واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے ہیں تو اسے ایسا لگا کہ ایک پنجرے سے نکل کر وہ دوسرے پنجرے میں آ گیا ہے۔ یہیں پر ایجادی قفس اور طاؤس چمن کی معنویت قاری پر منکشف ہوتی ہے۔ وہ گھر پہنچتا ہے اور فلک آرا اس کی گود میں آ کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی مینا کے نئے نئے قصے سنانا شروع کر دیتی ہے۔

(یہ کہانی پچپن صفحات پر محیط ہے)

نیر مسعود نے اپنی کہانی کو بالکل نئے انداز میں اختتام تک پہنچایا ہے، پوری کہانی میں سب سے زیادہ تہہ داری اختتام میں ہی ہے، اس سے قبل کہیں بھی کہانی کی تفہیم میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، لیکن جب کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے تو اس کے سربستہ راز منکشف ہونے کے بجائے مزید الجھاؤ کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہی نیر مسعود کی سب سے بڑی فنکاری ہے۔ وہ فلک آرا سے ملاقات کی بات بتانے بعد کالے خاں کا جی لکھنؤ میں نہ لگنے اور بنارس چلے جانے کے بعد انگریزوں کے ساتھ ہی دیگر واقعات کی طرف جزوی اشارہ کرتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ کہانی تو وہیں ختم ہوگئی تھی جہاں فلک آرا اس کی گود میں آ کر بیٹھتی ہے اور اپنی مینا کے طرح طرح کے واقعات سنانا شروع کرتی ہے۔ یعنی اس کے بعد کا جو حصہ ہے اس کا کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اسی کی وجہ سے کہانی کی قرأت کے بعد غور کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے، یوں تو ہر قاری کوئی بھی کہانی پڑھنے کے بعد اس کے مختلف گوشوں پر غور و فکر کرتا ہے اور ایک اچھی کہانی بھی وہی ہے جو غور کرنے پر مجبور کرے، لیکن نیر مسعود نے بڑی فنکاری کا مظاہرہ کیا اور سب سے پہلے تو انھوں نے کہا کہ ''گھر پہنچا تو سب کچھ پہلے کی طرح نظر آیا، فلک آرا پہلے تو کچھ کھنچی کھنچی رہی، پھر میری گود میں بیٹھ کر اپنی مینا کے نئے نئے قصے سنانے لگی۔''

سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب مینا فروخت ہوگئی تھی تو فلک آرا کے پاس ''اس کی'' اپنی مینا آئی کہاں سے؟ جو اسے وہ نئے نئے قصے سنانے لگی۔ یہیں سے ایک باذوق قاری کا فکری عمل شروع ہوتا ہے۔ پھر کالے خاں جزوی واقعات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ قصہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا ہے یعنی ایک بار پھر وہ قاری کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے سوچنے کا عمل بند نہ کرے۔ یہی نیر مسعود کے فن کا فسوں ہے۔

دونوں کہانی کاروں نے زوال اودھ کی کہانی اپنے اپنے انداز میں بیان کی ہے۔ ایک طرف واجد علی شاہ اور ان کے ایجادی قفس کی کہانی ہے تو دوسری طرف شطرنج کے بازیگروں کا جوش و خروش ہے۔ واجد علی نے جو ایجادی قفس بنوایا اور نیر مسعود نے قاری کو اس سے روبرو کرایا اسی ایجادی قفس میں پریم چند کے دونوں بازیگر شہ اور مات کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جتنا پرندے ایجادی قفس میں پھدک سکتے تھے اتنا ہی خود واجد علی شاہ بھی حاکم وقت ہونے کے باجود اپنا حکم چلا سکتے تھے۔ جس وقت واجد علی شاہ نے ایجادی قفس بنوایا، اس وقت ان کو اس بات کا احساس بھی نہیں رہا ہوگا کہ یہ ایجادی قفس وہ ان پرندوں کے لیے نہیں بنوا رہے ہیں بلکہ اسے خود اپنے اور اپنی رعایا کے لیے بنوا رہے ہیں۔ نواب اور ان کے ملازمین پرندوں کو اپنے ایجادی قفس میں جس طرح چاہتے رکھتے اور جو بولی چاہتے ان کو سکھاتے یعنی یہی عمل اس دوسرے قفس کا تھا جسے انگریز نے اپنی چالوں سے بنایا تھا جس میں نواب کی حیثیت ان پرندوں سے زیادہ نہیں تھی جو ان کے ایجادی قفس میں قید تھے۔ ہاں ان دونوں میں فرق اتنا ضرور تھا کہ نواب کو اپنے پرندوں سے محبت تھی، وہ اپنی میناؤں کو پیار سے مختلف ناموں مثلاً چلبلی بیگم، حیادار دلہن، نازک قدم، آہو چشم، زہرہ پری اور فلک آرا کے نام سے پکارتے تھے اور ان کی ناز برداری کرتے تھے، مگر یہاں وہ جس کے قیدی تھے اس کو ان سے نہ کوئی محبت تھی اور نہ ہی انسیت۔ اس کو اگر کوئی مطلب تھا تو صرف حکومت سے کیونکہ وہی اس کا مطمح نظر تھا۔ واجد علی شاہ کی صف میں کوئی فلک آرا بھی نہیں تھی جو یہ بتا دیتی کہ:

فلک آرا شہزادی ہے، دودھ جلیبی کھاتی ہے۔

جو اشارہ ہوتا کہ واجد علی شاہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ شاہ اودھ ہیں جن کے دستر خوان پر لوگ بیٹھنا اپنی توقیر سمجھتے تھے۔

جب واجد علی شاہ قیدیِ فرنگ ہوئے تو ان دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں اسے بیان کیا، لیکن ان دونوں نے بھی اپنی

پوری کہانی میں کسی ایسے شخص کی نشاندہی نہیں کی ہے جس میں مینا فلک آرا کے برابر بھی ہمت ہو۔ پریم چند نے ان الفاظ میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے:

نواب گھر سے اسی طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے، بیگمیں روئیں ،نواب روئے، مامائیں، مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، کسی بھی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بےضرر نہ ہوئی ہوگی، کم ازکم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔

(پریم چند کے مختصر افسانے، ص: ۲۳۰، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی ۱۹۷۸، مرتب: رادھا کرشن)

جب کالے خاں کو جیل سے رہائی ملی اور وہ گھر کے لیے نکلے ان کو نہیں معلوم تھا کہ باہر کے حالات کیا ہیں حالانکہ اس وقت واجد علی شاہ تخت سے اتار کر کلکتہ بھیجے جا چکے تھے۔ نیر مسعود نے اس منظر کو اس طرح پیش کیا ہے:

کچھ دور تو میں اپنی دھن میں نکلا چلا گیا، پھر مجھے سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہونے لگا، شہر پر عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی، چوڑے راستوں پر گوروں کے فوجی دستے گشت کر رہے تھے اور میں جس گلی میں مڑتا اس کے دہانے پر انگریزی فوج کے دو تین سپاہی جمے ہوئے نظر آتے تھے۔ گلیوں کے اندر لوگ ٹولیاں بنائے، چپکے چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے، مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی، اس لیے کہیں رکا نہیں، لیکن ہر طرف ایک ہی گفتگو تھی، رکے بغیر بھی مجھے معلوم ہوگیا کہ اودھ کی بادشاہی ختم ہو گئی، سلطان عالم واجد علی شاہ کو تخت سے اتار دیا گیا ہے۔

(ص: ۲۰۴، طاؤس چمن کی مینا، مطبوعہ عرشیہ پبلی کیشن دہلی، ۲۰۱۳ء)

نیر مسعود نے بھی کسی بھی ایک ایسے شخص کی نشان دہی نہیں کی جو سلطان عالم کے لیے گھر سے نکلا ہو۔ یعنی اس وقت اودھ میں مینا فلک آرا سے بھی پست ہمت لوگ تھے جن میں کچھ بولنے کی ہمت اور سکت نہیں تھی۔

اگر ان دونوں کہانیوں کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فنی طور سے نیر مسعود کی کہانی پریم چند کی کہانی سے بالاتر ہے۔ پریم چند کی کہانی سپاٹ ہے اور بیانیہ کمزور، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار کہانی میں خود در آتے ہیں اور کہانی سنانے کے بجائے خود تقریر کرنے لگتے ہیں وہ شعوری طور پر کہانی اور قاری کے مابین حارج ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پریم چند کی گرفت کہانی پر کمزور ہے اس لیے وہ اپنے قاری کی توجہ اصل موضوع کی طرف مبذول کرانے کے لیے اس کی رہنمائی کرنے لگتے ہیں۔ تخلیق کار کا کہانی میں در آنا فنی طور سے کوئی مستحسن عمل نہیں ہے بلکہ اچھی کہانی وہ ہوتی ہے جس میں تخلیق کار کے بجائے کہانی اور اس کے کردار قاری کی رہنمائی کریں، مگر پریم چند کی اس کہانی میں ایسا نہیں ہے۔ کہانی اور قاری کے مابین تخلیق کار کے حارج ہونے کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

کہانی کار اپنی کہانی کا آغاز اس طرح کرتا ہے۔

''واجد علی شاہ کا زمانہ تھا لکھنؤ عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا تھا، چھوٹے، بڑے، غریب، امیر سب ہی عیش ومستی میں غرق تھے، کوئی رقص وموسیقی کی محفل سجاتا تھا، کوئی افیون کی پینک میں مزے لیتا تھا، زندگی کے ہر ایک شعبے میں رنگینی چھائی ہوئی تھی، سیاست میں، ادب اور آرٹ میں، مجلسی زندگی میں، صنعت وحرفت میں، باہمی برتاؤ اور لین دین میں، غرض کہ ہر جگہ نفس پرستی اور عیش وعشرت کی چھاپ تھی''۔

(طوالت کی بنا پر بقیہ حصہ حذف کیا جاتا ہے)

دو طویل پیراگراف کے بعد اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی کہانی نہیں مضمون ہو جس میں اودھ کے حالات کے بارے میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ کہانی کار کہانی اور قاری میں ابتدا سے ہی حارج ہو جاتا ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

محلے میں دو چار بڑے بوڑھے تھے، وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے، اب خیریت نہیں ہے، جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگی، لچھن برے ہیں، ملک میں واویلا مچا ہوا تھا، رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی، مگر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھنچی چلی آتی تھی اور یہاں عیش وعشرت میں صرف ہو جاتی تھی، انگریز کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا، اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی، یہاں تک کہ سالانہ ٹیکس بھی ادا نہ ہوسکتا تھا، ریزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا، دھمکیاں دیتا، مگر یہاں سارے لوگ نشے میں چور تھے، کسی کے کانوں پر جوں نہ رینگتی تھی۔

(پریم چند کے مختصر افسانے، ص: ۲۲۷)

پریم چند نے کہانی ان جملوں پر چھوڑی تھی ''بیگم صاحبہ کہتیں، مجھے تو

یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا، پر کیا کروں، میرا کیا بس ہے؟

اس کے بعد پریم چند نے اتنی لمبی چوڑی تقریر کی اور ملک کے ذمہ داران وعوام پر ماتم کیا، دوبارہ وہ کہانی کی طرف ستانے کے بعد آتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''خیر میر صاحب کے دیوان میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے۔''

یعنی کہانی کا اب دوبارہ انسلاک ہوا ہے۔ اسے فنی سقم کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا ہے۔

دوسری مثال دیکھئے:

ادھر ملک میں سیاسی حالت خطرناک ہوتی جاتی تھی، کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھتی چلی آتی تھیں، شہر میں ہلچل مچی تھی، لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں کی طرف بھاگے چلے جارہے تھے، لیکن ہمارے دونوں کھلاڑیوں کو اس کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو کر، کہیں کسی بادشاہی ملازم کی نگاہ نہ پڑ جائے، ہزاروں روپے کی سالانہ جاگیر مفت ہی میں ہضم کرنا چاہتے تھے۔

(پریم چند کے مختصر افسانے، ص:۲۲۹)

تیسری مثال دیکھیں:

چار کا گجر بج رہا تھا کہ فوج کی واپسی کی آہٹ ہوئی۔ نواب واجد علی شاہ پکڑ لیے گئے تھے اور فوج انہیں نامعلوم مقام پر لے جارہی تھی، شہر میں نہ کوئی ہلچل تھی نہ کوئی مار کاٹ، یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا، نواب گھر سے اسی طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے، بیگمیں روئیں، نواب روئے، مامائیں، مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، کسی بھی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی، کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں، یہ وہ اہنسا نہ تھی جس پر فرشتے خوش ہوتے ہیں، یہ وہ پست ہمتی تھی، جس پر بڑے بڑے بزدل آنسو بہاتے ہیں۔

اودھ کا فرماں روا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا، یہ سیاسی زوال کی انتہا تھی۔

(پریم چند کے مختصر افسانے، ص:۲۳۰)

پھر لکھتے ہیں:

مرزا نے کہا حضور نواب صاحب کو ظالموں نے قید کرلیا ہے

یعنی اب کہانی دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ یہاں بھی کہانی کار بیچ میں آجاتا ہے، جس کے داخلی شواہد موجود ہیں۔ جب فوج مسجد کے پاس سے گزری تھی اور یہ واقعہ اہم تھا تو کہانی کار کو فوج کے ساتھ جانا چاہئے تھا اور وہاں کے حالات وواقعات سے قاری کو واقف کراتا خواہ چند ثانیے کے لیے ہی جاتا، مگر ایسا نہ کر کے تخلیق کار خود شطرنج کے پاس بیٹھے بیٹھے ہی ماتم کر رہا ہے اور جب فوج واپس آجاتی ہے تو وہ کہانی دوبارہ شروع کرتا ہے جتنی دیر فوج شہر میں رہتی ہے کہانی کار صرف ماتم کرتا ہے اور کہانی کے بیچ حارج رہتا ہے۔

اس کے برعکس نیر مسعود کا فن نکھرا نکھرا ہے۔ وہ ابتدا سے ہی کہانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں اور کہیں بھی خود حارج ہونے کی کوشش نہیں کرتے ہیں بلکہ کہانی آبشار کی طرح خود بخود آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور قاری اس کے ساتھ بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ نیر مسعود کی کہانی سپاٹ نہیں ہے بلکہ زبان وبیان کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی کہانی میں علائم کا بھی استعمال کیا ہے۔ ایجادی قفس ان کی ایک ایسی افسانوی علامت ہے جو اس سے قبل کہیں اور نہیں دکھائی دیتی۔ یوں تو اکثر وبیشتر بادشاہوں کو چرند وپرند پالنے کا شوق رہا ہے جس کی تاریخ لکھی گئی، مگر نیر مسعود نے جس نوتاریخیت کا مظاہرہ اپنی اس کہانی میں تخلیقی وفور کے ساتھ کیا ہے اس کی مثال ادب میں نہیں ملتی۔ انہوں نے اودھ کی تاریخ کو اس کے اصل پس منظر میں علائم کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میرا مقصد ان کی تاریخ نویسی سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ اصل یہ دکھانا ہے کہ وہ کس فنی رچاؤ کے ساتھ کہانی تخلیق کرتے ہیں جس میں تاریخ بھی مسخ نہیں ہو پاتی، اس کے برعکس قاضی عبدالستار نے بھی تاریخی ناول لکھے اور عبدالحلیم شرر نے بھی، مگر ان دونوں کے یہاں تاریخی شعور اصل کے ساتھ ہونے کے بجائے تخلیقیت میں جذب ہوگیا، حالانکہ تخلیقی ادب میں تاریخ کی تلاش کارِ عبث ہے، لیکن اگر کوئی تخلیق کار اس کی استطاعت رکھتا ہو اور اس کو تاریخ پیش کرنے کا ایسا سچا شعور ہو تو اس کا اعتراف بھی ضروری ہے، لیکن ایک جگہ نیر مسعود اس باب میں پھسلے ہیں، انھوں نے ایسا کیوں کیا یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ کالے خاں جب قید سے رہا ہوا اور گھر کی طرف چلا اور اس کو معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ معزول کئے جاچکے ہیں اور قید فرنگ میں وہ کلکتہ بھیج دیے گئے اس کا بیان وہ آخر میں کرتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ لکھتے ہیں:

''رکے بغیر مجھے معلوم ہوگیا کہ اودھ کی بادشاہی ختم ہوگئی، سلطان عالم واجد علی شاہ، کو تخت سے اتار دیا گیا ہے، وہ لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اودھ کی سلطنت انگریزوں کے ہاتھ

میں آ گئی ہے''

اس پیرا گراف میں انھوں نے قید فرنگ کا ذکر کرنے کے بجائے ''لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے ہیں'' جیسے جملے کا استعمال کیا ہے۔ جب کہ بہر صورت واجد علی شاہ کی گرفتاری اور کلکتہ بھیجا جانا اس وقت کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ پتہ نہیں کیوں نیر مسعود نے حقیقت لکھنے کے بجائے ایک عام سا جملہ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس جملے سے کہانی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن مرقوم جملے سے کہانی پر یہ فرق ضرور پڑتا ہے کہ قاری کے ذہن میں سوال کلبلانے لگتا ہے کہ واجد علی شاہ گئے کہاں؟ اس وقت وہ کیا کر رہے ہیں؟ کیا وہ دوبارہ حصول حکومت کے لیے کوئی لائحۂ عمل تیار کر رہے ہیں، انگریزوں سے لڑنے کے لیے نئی فوج تشکیل دے رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ غیر ضروری ذہنی انتشار ہے جس میں قاری کو مبتلا کیا گیا ہے۔ حالانکہ میں فکشن کو تاریخ نہیں مانتا لیکن فکشن کی بھی اپنی ضروریات ہوتی ہیں، اس کا اپنا متن ہوتا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے قاری کا انسلاک اور جڑاؤ ہوتا ہے۔ وہ ہر جملہ اور ہر پیرا گراف بہت سوچ سمجھ کر پڑھتا ہے اور جہاں کوئی بات نہیں سمجھ میں آتی ہے یا سوالات ابھرتے ہیں تو وہ فوراً ٹھٹک کر سوچنے لگتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے سوالات چھوڑے جائیں جہاں غور و فکر سے قاری پر کچھ سربستہ راز منکشف ہوں جیسے خود نیر مسعود نے آخر میں کیا ہے، لیکن ایسے سوالات چھوڑنے سے اجتناب ضروری ہے جو ضیاع وقت، ذہنی انتشار کا سبب اور لاحاصل ہوں۔

نیر مسعود اور پریم چند کی زبان میں بھی کافی فرق ہے، پریم چند کے یہاں سیدھا بیانیہ ہے، وہ بہت سیدھے اور سادے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں جیسے کوئی کہانی لکھ نہیں رہا ہو بلکہ سنا رہا ہو جس میں زبان کے رچاؤ کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا، مگر نیر مسعود نے اس کے برعکس اپنی کہانی میں زبان اور خاص کر اودھ کی زبان کو اس کے رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کالے خاں کی بیٹی فلک آرا اپنے والد سے کہتی ہے کہ وہ اس کے لیے ایک پہاڑی مینا لا دیں۔ اس کو نیر مسعود دیکھئے کس انداز میں پیش کرتے ہیں:

''خود اس نے ابھی فرمائشیں کرنا نہیں سیکھا تھا، لیکن ایک دن مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک بولی:

ابا، اللہ ہمیں پہاڑی مینا لا دو

میں چپ رہ گیا، بیوی کے مرنے کے بعد میں نے قسم کھالی تھی کہ اب گھر میں کوئی پرندہ نہیں لاؤں گا۔''

(طاؤس چمن کی مینا، ص: ۱۵۷)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

دوسرے دن میں وقت سے بہت پہلے گھر سے نکل کھڑا ہوا، ننھی فلک آرا نے روز کی طرح چلتے چلتے یاد دلایا:

ابا ہماری پہاڑی مینا....

ہاں بیٹی لائیں گے....

آپ روز بھول جاتے ہیں، اس نے ٹھنک کر کہا اور میں دروازے سے باہر آ گیا۔

(طاؤس چمن کی مینا، ص: ۱۵۹)

ان دونوں مثالوں کی قرأت ذرا غور سے کی جائے تو دونوں میں لسانی رچاؤ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فلک آرا کی زبان ذرا دیکھیں اور پھر لکھنؤ کی زبان پر غور کریں ایسا لگتا ہے کہ نیر مسعود کوئی ٹیپ ریکارڈر ہیں انھوں نے جو سنا رقم کر دیا۔ اس افسانے میں صرف یہی دو مثالیں نہیں ہیں بلکہ پوری کہانی زبان کی صلابت کی منھ بولتی مثال ہے اور کیوں نہ ہو نیر مسعود خود بھی تو اسی مٹی سے گوندھے گئے ہیں جب کہ پریم چند کے یہاں سب کچھ کسبی ہے۔

نیر مسعود کی کہانی ہر اعتبار سے پریم چند کی کہانی کے مقابلے دلچسپ ہے۔ پریم چند کے یہاں سب کچھ واضح ہے قاری کو کہیں ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ دو دو چار کی طرح سب عیاں، ہر چیز منکشف ہے، فنی اعتبار سے سب کچھ عیاں ہونا، پوری کہانی میں کوئی بات قابل غور نہ ہونا فنی طور سے مستحسن نہیں جبکہ نیر مسعود کے یہاں تہہ داری ہے، اس کی تفہیم کے لیے ذہن پر بوجھ ڈالنا پڑتا ہے اور غور و فکر کرنا پڑتا ہے تب جا کر کہیں اس کے سرے گرفت میں آتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ دونوں کہانیاں ایک ساتھ مل کر ہی زوال اودھ کی کہانی اور اس کے اسباب و محرکات سے قاری کو واقف کراتی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں شطرنج کے کھلاڑی شاہ عالم کے ایجادی قفس میں پھنس کر اپنے سبھی مہروں کے ساتھ بازی ہار جاتے ہیں اور خود شاہ عالم قیدیِ فرنگ ہو جاتے ہیں۔

○○

○○